پاکستان اور جمہوریت.......ایک فکر انگیز مراسلہ (1)

حرفِ تمنا

☆☆☆☆☆

ارشاد احمد حقانی

پاکستان میں جمہوری روایت اور کلچر (پارلیمانی یا صدارتی) کیوں پختہ نہ ہوسکے اور اب اس مقصد کا حصول کس طرح ممکن ہے، یہ ایسے سوالات ہیں جن پر ہمارے ہاں سال ہا سال سے بحث و گفتگو ہورہی ہے۔ ہمارے لئے چونکہ ایک جمہوری نظام اپنائے بغیر چارہ نہیں اس لئے اس طرح کی بحث مفید اور تعمیری قرار دی جاسکتی ہے۔ اسی طرح پاکستان میں ان سوالات پر بھی بحث و گفتگو ہورہی ہے (زیادہ تر اسی کالم میں) کہ سابق وزرائے اعظم بینظیر بھٹو اور میاں نواز شریف کو پاکستان واپس آنے کی اجازت ملنی چاہئے یا نہیں، ان کے آنے سے جمہوری عمل کو کوئی فائدہ ہوگا یا اسی قسم کی غلطیاں پھر دہرائی جائیں گی جیسی ان دونوں کے دو دو ادوار حکمرانی میں سرزد ہوئیں۔ میرے خیال میں یہ بحث بھی مفید قرار دی جاسکتی ہے کیونکہ اس سے مسئلے کے مالہ وماعلیہ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ راقم نے 28 اور 29 رفروری کو "بینظیر اور نواز شریف کی واپسی کی بحث" کے عنوان سے دو کالم شائع کئے جن میں صحافی احمد بشیر اور قانون دان سید فیروز شاہ گیلانی کے خطوط شامل کئے گئے۔ ان دونوں حضرات نے بینظیر اور نواز شریف کی واپسی کو غیر مفید قرار دیا تھا اور میرے استدلال سے اختلاف کیا تھا۔ میں نے ان دونوں خطوط کا مختصر جواب دیا۔ اب کراچی سے سید فیروز شاہ گیلانی کا ایک تفصیلی اور مدلل جواب الجواب موصول ہوا ہے جس میں زیر نظر موضوعات کے حوالے سے غور و فکر کا بڑا سامان ہے۔ میں آج ان کا یہ دوسرا خط یہاں شائع کررہا ہوں اور انشاء اللہ اگلے روز اس پر تبصرہ کروں گا۔ گیلانی صاحب لکھتے ہیں:

"میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرے خط کو اپنے کالم میں جگہ دی۔ پاکستان میں جمہوریت اور قانون کی حکمرانی قائم کرنے کے لئے میں اس وقت کسی شخص یا جماعت کا نام نہیں بتا سکتا۔ ق لیگ سے کوئی امید نہیں کی جاسکتی۔ انہوں نے تو اقتدار میں آتے ہی ممبران اسمبلی اور سینٹ کے لئے کروڑوں روپوں کے ترقیاتی فنڈ مختص کرکے انتہائی غیر جمہوری اور ناجائز فیصلہ کیا۔ جمہوریت کی بنیاد ریاستی اداروں میں اختیارات کی تقسیم اور تخصیص ہوتی ہے۔ ہمارے قانون ساز پہلے ہی اپنا قانون سازی کا اہم کام نہ کرنے کے عادی ہیں۔ ترقیاتی فنڈ ان کو اپنے کام سے مزید دور کردیتے ہیں۔ قانون سازی کے سلسلے میں پچھلے سوا سال کی کارکردگی مایوس کن ہے جبکہ عوامی مسائل بڑھتے ہی جارہے ہیں۔ رہا فوجی حکمران کا معاملہ تو کوئی فوجی، جمہوریت اور قانون کی حکمرانی قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ نہ جانے آپ کو یہ خیال کیسے آیا کہ مجھے کسی ایک "مردے از غیب" کے آنے کا انتظار ہے۔ قرآن اور سنت کی رو سے ہمیں باہمی مشاورت پر مبنی جمہوریت کا حکم ملتا ہے نہ کہ ڈکٹیٹر شپ کا۔ موجودہ حالات میں قابل عمل راستہ یہ ہے کہ ہمیں متوسط طبقے کے پڑھے لکھے عوام دوست لوگوں سے استفادہ کرنا چاہئے۔ اس سلسلے میں تجربہ کار صحافی، دانشور، ادیب، وکیل، پروفیسرز، پروفیشنلز، ریٹائرڈ سویلین اور فوجی افسران، جج، اسمبلیوں سے باہر سیاستدان، این جی اوز چلانے والے سول سوسائٹی کے لوگوں پر مشتمل وفاقی اور صوبائی سطحوں پر بلکہ ضلعی سطحوں پر تھنک ٹینکس (Think tanks) بنانے کی ضرورت ہے جو حکومت اور اسمبلیوں کو تفصیلی تحقیقات کے بعد بلا معاوضہ مشاورت مہیا کریں۔ پچھلی صدی کے شروع تک برطانیہ میں پارلیمینٹ میں یونیورسٹیوں کی نمائندگی کے لئے نشستیں مخصوص تھیں۔ ہمارا موجودہ آئین تو صرف مراعات یافتہ اشرافیہ (Oligarchy) ہی کو ہر دفعہ اقتدار میں لاتا ہے۔ اس سے غریب عوام کی بھلائی کی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی۔ پچھلے سات انتخابات کوئی بہتری پیدا نہیں کرسکے۔ جہاں تک آرڈی نینسوں کے ذریعے قانون سازی کا معاملہ ہے تو ان میں اور مارشل لا ریگولیشنز میں کوئی فرق نہیں ہے۔ انگلستان کی تاریخ میں 17ویں صدی میں صرف ڈکٹیٹر کرامویل نے آرڈی نینسوں کے ذریعے جابرانہ حکومت کی تھی لیکن بعد میں اس کی قوم نے اس سے یہ انتقام لیا کہ اس کی ہڈیوں کو قبر سے نکال کر لٹکا دیا گیا۔ بھارت میں بھی وہاں کا سیاسی نظام نوآبادیاتی گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کی طرز پر بنایا گیا ہے جب برطانوی پارلیمینٹ نے یہ نوآبادیاتی بل پاس کیا تو چرچل نے اس غیر جمہوری عوام دشمن ایکٹ کو ان الفاظ میں بیان کیا

"A monument of shame, built by pigmies."

اس ایکٹ کی علامہ اقبالؒ نے متعدد بار مخالفت کی۔ انہوں نے قائداعظمؒ سے ملاقات میں اور پھر 1937ء میں ایک خط میں اسے انتہائی نقصان دہ آئین قرار دیا تھا۔ خود قائداعظمؒ نے علی گڑھ کے 1943ء کے جلسے میں اس نام نہاد پارلیمانی آئین کی کھل کر مخالفت کی تھی۔ اس سال اور 1997ء کی کراچی میں منعقدہ سارک لا کانفرنسوں میں مجھے ہندوستان کے چیف جسٹس صاحبان، دیگر ججوں اور نامور سینئر وکلا سے تبادلہ خیال کا موقع ملا۔ وہ سب ہندوستان میں عام غریب لوگوں کے لئے قانون کی حکمرانی کے فقدان کے شاکی تھے۔ آئین کے تحت جو ریاستی ڈھانچہ ہندوستان میں بنا ہے اس میں سیاست criminalize ہوچکی ہے (یعنی جرائم پیشگی بن چکی ہے) وہاں دولت اور مافیا چھا چکا ہے۔ اسمبلیوں میں درجنوں کی تعداد میں جرائم میں ملوث لوگ پہنچ چکے ہیں۔ ہندوستان میں عدلیہ بھی ناگفتہ بہ حالت میں پہنچ چکی ہے۔ کسی کیس کا بارہ سے پندرہ سال سے کم میں فیصلہ نہیں ہوتا۔ نچلی عدالتوں میں دو کروڑ سے زیادہ تعداد میں کیس معرض التوا میں پڑے ہوئے ہیں۔ بھارتی ہائی کورٹوں میں چالیس لاکھ مقدمات التوا کا شکار ہیں۔ نچلی عدلیہ میں کھلے عام کرپشن معمول بن گئی ہے۔ غریب آدمی کے لئے انصاف کا حصول ناممکن ہے۔ ہندوستان میں اس وقت خوفناک پولیس راج ہے۔ ایک سینئر ہندوستانی وکیل نے اپنی تقریر میں پولیس کو اس طرح بیان کیا "conglomerate of organized thiefs and dacoits" وہاں پولیس کی حراست میں خوفناک تشدد اور اموات پاکستان سے کہیں زیادہ ہیں۔ وہاں بھی پاکستان کی طرح ایف آئی آر درج کرانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ ہندوستان کے مشہور قانون دان اور دانشور نینی پالکھی والا نے اپنی کتاب "We the Nation" میں وہاں کی جمہوریت اور انتخابات کے بارے میں یوں لکھا ہے۔

"Adult franchise may give you the right to choose your tyrants."

اس لئے یہ اشد ضروری ہے کہ ہم اپنے معاملے میں بھارت کی مثال کو قطعی نہ اپنائیں۔ ہمیں تو ان جمہوری معاشروں کی مثالوں سے استفادہ کرنا چاہئے جنہوں نے حقیقی جمہوری طور طریقوں پر عمل کرتے ہوئے اپنے ممالک کو دنیا کے صف اول کے ممالک بنا دیا ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں ایک نئے عمرانی معاہدے (New social contract) کی اشد اور فوری ضرورت ہے۔ پاکستان کو اس صدارتی طرز کی جمہوریت کو اپنانا چاہئے جو امریکہ میں 27 ترامیم کے ساتھ اس وقت رائج ہے اگر ہم F-16، راڈار اور دیگر جدید ٹیکنالوجی امریکہ سے لینے کے لئے بے تاب رہتے ہیں تو پاکستان کے مفاد میں وہاں کے جمہوری نظام سے فائدہ کیوں نہ اٹھایا جائے اگر ہم پارلیمانی جمہوریت پر ہی بضد ہیں تو ہمیں برطانیہ، کینیڈا، آسٹریلیا، جاپان جیسے جمہوری ممالک سے استفادہ کرنا چاہئے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو پارلیمانی جمہوریت صرف چھوٹی آبادی کے ممالک میں ہی کامیاب ہوسکتی ہے۔ برطانیہ کی مثال کے مطابق ہمیں عوامی ایوان (ہاؤس آف کامنز) بنانے کے لئے پاکستان کی نیشنل اسمبلی کے لئے 1700 اراکین کی ضرورت ہوگی (ایک نشست 88,000 کی آبادی پر مشتمل ہوگی) مگر یہ ایک مضحکہ خیز صورتحال ہوگی۔ اس وقت برطانیہ کی پارلیمان میں 85 فیصد کے قریب ممبران متوسط یا نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن میں بڑی تعداد میں کارکن صحافی، وکیل، ادیب، چھوٹے کاروباری، پنشن یافتہ، کاشتکار، گھریلو خواتین شامل ہیں جو مکمل طور پر جمہوری جماعتوں کی نمائندگی کرتے ہوئے اپنے زور اور قابلیت پر منتخب ہوکر آتی ہیں۔ وہاں 659 کے ہاؤس میں امیر لوگوں کی تعداد صرف 50 ہے۔

1973ء کا پاکستانی آئین مکمل طور پر نوآبادیاتی ڈھانچہ مہیا کرتا ہے جبکہ ہر جمہوری نظام میں مقامی انتظامیہ اور پولیس لوکل گورنمنٹ کے تحت کام کرتے ہیں۔ وہاں ان اداروں کا مرکزی کیڈر نہیں ہوتا۔ امریکی صدارتی نظام میں تھانیدار (Sheriff) مقامی لوگوں کے ووٹوں سے چار سال کے لئے منتخب ہوتا ہے۔ اس طرح ڈسٹرکٹ اٹارنی اور کاؤنٹی (ضلع) کے جج بھی ایک مخصوص مدت کے لئے منتخب ہوتے ہیں۔ فوجداری مقدمات باہمی مشاورت کے اصول پر مبنی جیوری کے ذریعے فیصل ہوتے ہیں۔ امریکی صدر اپنی صوابدید پر کسی کو جج مقرر نہیں کرسکتا۔ کسی کو کانگریس کی منظوری کے بغیر اپنا وزیر مقرر نہیں کرسکتا اور تو اور وہ اپنی مرضی سے سفیر تک مقرر نہیں کرسکتا۔ علامہ محمد اسد (Leopold Wess) اپنی کتاب "Principles of State and government in Islam" میں رقمطراز ہیں کہ امریکی آئین میں چیک اینڈ بیلنس کا بہترین نظام قائم کیا گیا ہے۔ ان کے بقول یہی نظام ہر اسلامی معاشرے کے لئے بہترین ہے۔ قائداعظمؒ بھی اس جمہوری نظام کو پسند کرتے تھے۔ انہوں نے وائسرائے کے ساتھ مذاکرات کے دوران اپنے رف پیڈ پر اپنے خیالات لکھتے ہوئے پاکستان کے لئے صدارتی جمہوریت کو مناسب قرار دیا تھا۔

جہاں تک طبقاتی بنیاد پر اسمبلی نشستوں کا معاملہ ہے تو یہ بھی قابل عمل نہیں ہے۔ آج سے 32 سال قبل ہونے والی زرعی اصلاحات کے مطابق ایک شخص 150 ایکڑ سے زیادہ کا مالک نہیں ہوسکتا تھا۔ اس وقت سے اب تک دو نسلیں آچکی ہیں اسلامی قانون وراثت بھی عمل کررہا ہے لیکن پھر بھی بڑی بڑی زمینداریاں، فیوڈلزم، سرداری نظام پورے طمطراق سے قائم ہے۔ خود بینظیر بھٹو کے پاس اتنی بڑی زمینداری کا کیا جواز ہوسکتا ہے جب پوچھا جائے گا تو ہر بڑا زمیندار اپنے آپ کو چھوٹا زمیندار ثابت کردے گا۔ تین چوتھائی زمین تو اس نے غیر قانونی قبضے سے ہتھیا رکھی ہے جو غریب کاشتکار مزارعین کے نام ہوتی ہے۔ امریکہ میں جمہوری سیاسی نظام کی وجہ سے 30,25 ہزار ایکڑ کے مالک بھی فیوڈل نہیں بن سکتے۔ اسی طرح بڑے بڑے سرمایہ دار اصل آمدنی کا پانچواں حصہ بھی ظاہر نہیں کرتے تاکہ ٹیکس نہ دینا پڑے۔ ان حقائق کی روشنی میں اور 1988ء سے 1999ء تک کی سویلین حکومتوں کی کارگزاری دیکھتے ہوئے ہم کس طرح یہ امید کرسکتے ہیں کہ بینظیر بھٹو اور نواز شریف اپنے طبقاتی مفادات چھوڑ دیں گے اور ملک و قوم کی بے لوث خدمت کریں گے؟ ان کے دلوں کی تبدیلی کی کوئی مثال یا شہادت تو قوم کے سامنے آنی چاہئے جہاں تک ان دونوں سیاستدانوں کے تجربہ کار ہونے کا معاملہ ہے تو وہ بھی مشکوک ہے۔ برطانیہ میں وہ شخص پہلی مرتبہ وزیراعظم بنتا ہے جو اوسطاً چوبیس سال پارلیمینٹ کا رکن رہ چکا ہو۔ اسی طرح ایک وزیر اوسطاً چودہ سال پارلیمینٹ میں گزارنے کے بعد وزیر بننے کے قابل ہوتا ہے۔ پھر وہاں ظلی کابینہ (Shadow cabinet) کی موجودگی سے حزب مخالف کو بھی حکومتی کارگزاری کو چیک کرنے اور حکومت کو تجاویز دینے کا تجربہ ہوجاتا ہے۔ پاکستان میں تو ایسی کوئی صورتحال نہیں ہے۔ اس تناظر میں ان دونوں سیاستدانوں کو کوئی قابل ذکر تجربہ نہیں ہے۔

میں آپ سے ایک بار پھر درخواست کرتا ہوں کہ آپ اپنی اہمیت کو سمجھتے ہوئے قوم کو پیشہ ور سیاستدانوں سے اجتناب کرنے کا مشورہ دیں۔ ان کے متعلق یک طرفہ خوش فہمی کا حقیقتاً کوئی جواز نہیں ہے۔ آپ کھلے دل کے انسان ہیں۔ میں آپ سے ذہنی ہم آہنگی محسوس کرتا ہوں اس لئے آپ کو یہ تفصیلی خط لکھ رہا ہوں۔ اب اجازت

آپ کا مخلص۔ سید فیروز شاہ ایڈووکیٹ چیئرمین تحریک عدل

(جاری ہے)......